گھنی مونچھیں، پراسرار مسکراہٹ اور کراچی کے قبرستان میں ایک قبر

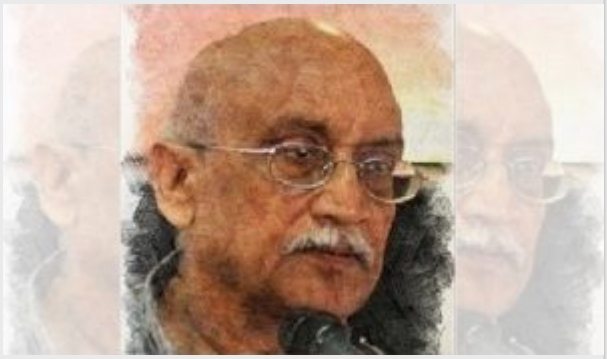

وہ سب کچھ خیابانِ محافظ اور خیابانِ غاضی کے موڑ پہ ہوا۔ میں اپنی ٹویوٹا کیری میں تیزی سے موڑ کاٹ کر نکلی تھی کہ سامنے سے ہی وہ بڑی سی پجارو آگئی اور میری گاڑی پوری شدت کے ساتھ پجارو سے جا ٹکرائی۔ میرے تو جیسے ہوش اڑگئے۔ گاڑی کا نقصان ہوا مگر خوش قسمتی سے مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے زور لگا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر پوری شدت سے اس ڈرائیور پر چڑھ دوڑی تھی۔

"اندھے ہو۔ دیکھ کر نیں چلتے ہو۔ مار دیا میری گاڑی کو۔ پتا نہیں کن لوگوں نے تمہیں گاڑی دی ہے۔ ڈرائیور بنا دیا ہے۔ " میں چیخ ہی رہی تھی کہ ایک بھاری بھرکم آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "میں نے گاڑی دی ہے اسے، میں نے ڈرائیور بنایا ہے اس کو، سارا قصور میرا ہے۔ اس کا کیا قصور ہے، کچھ بھی نہیں۔ ناراض اس پہ نہ ہوں مجھ پہ ہوں۔ اس غریب پہ کیوں برس رہی ہیں۔ "

میں نے چونک کر دیکھا۔ پجارو کے دوسری طرف کلف والی سفید شلوار سفید قمیض میں ملبوس وہ لمبا سا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے سرخ وسفید چہرے پر بھری بھری سیاہ مونچھیں اور گنجان بھنوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ نہ سمجھ میں آنے والی پراسرار، گھمبیر، خوف ناک، زہریلی نجانے کیا؟

میں نے بالکل گڑبڑا کر اپنا دوپٹا ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔

"بی بی آپ کی گاڑی بن جائے گی، فکر نہ کریں میرے ڈرائیور کی غلطی ہے۔ آپ کو میرا ڈرائیور گھر چھوڑ آئے گا۔ میں نے پہلی دفعہ دیکھا کہ پجارو کے پیچھے ایک دوسری پجارو نما گاڑی کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور دروازہ کھول کر مجھے اشارے سے بلا رہا تھا۔

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ پہلے گھر جاؤں اور گھر جا کر بتاؤں۔ اس وقت میرے پاس لائسنس بھی نہیں تھا۔

میں گھر سے مائیکل ڈگلس کی فلمیں لینے نکلی تھی۔ میں اس وقت آئی بی اے میں پڑھتی تھی اور فائنل کا امتحان دے کر فارغ ہی ہوئی تھی۔ مجھے ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ویسے تو انڈیا کی فلمیں بھی اچھی لگتی تھیں خاص طور پہ امیتابھ بچن، شاہ رخ، جوہی چاؤلہ اور مادھوری ڈکشٹ کی مگر بنیادی طور پر ہالی ووڈ کی فلموں میں بڑی شوقین تھی۔ چھٹیوں میں ہم سہیلیوں نے مختلف پروگرام بنائے تھے۔ چار دن پہلے عذرا کے گھر پر جمع ہوکر ہم سب نے جولیا رابرٹس اور نکول کڈمین کی فلمیں دیکھی تھیں۔

آج مجھے مائیکل ڈگلس اور رابرٹ ڈی نیرو کی فلمیں لانی تھیں۔ آج سب ہی لوگوں نے میرے گھر پر آنا تھا۔ جلدی کی کوئی وجہ تو نہیں تھی مگر نجانے کیوں میں بڑی بے پروائی سے تیز گاڑی چلاتی ہوئی خیابان محافظ سے مڑی تھی۔

مڑی کیا میں نے سرخ سگنل کا بھی خیال نہیں کیا اور مڑگئی تھی کہ اس پجارو سے میری گاڑی جا ٹکرائی اور یکایک یہ حادثہ ہو گیا۔

میں تقریباً دوڑتی ہوئی دوسری گاڑی میں بیٹھی تھی۔ ابو اور بھیا گھر میں ہی موجود تھے۔

میرے حواس بحال ہوئے تو ان کی سمجھ میں آیا کہ میں کیا کرکے آئی ہوں۔ مجھے پتا تھا کہ غلطی سراسر میری ہے۔ ابو کے منع کرنے کے باوجود میری عادت تھی کہ میں گاڑی کافی تیز چلاتی اوراکثر سرخ نشان کا بھی خیال نہیں کرتی تھی۔

پانی پی کر ہم لوگ دوسری گاڑی سے جلدی جلدی واپس اس موڑ پر پہنچے تو دیکھا کہ میری گاڑی کو ایک دوسری گاڑی کھینچ کر گزری کی طرف لے جارہی ہے۔ ہم لوگوں نے جا کر دوسری گاڑی روکی تو اس میں بیٹھے ہوئے مکینک نما ایک آدمی نے بتایا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ گاڑی کو مرمت کرکے آپ کے ایڈریس پر پہنچا دیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے شاہ صاحب کا فون نمبر بھی دیا کہ اگر کوئی بات کرنی ہے تو ان سے کرلیں۔

مجھے پتا تھا کہ غلطی میری تھی لیکن یہ لوگ مجھے کچھ کہنے کے بجائے الٹا میری ہی گاڑی بنوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ عجیب بات تھی، بالکل عجیب۔ اس کی پراسرار سی مسکراہٹ کی طرح۔

ابو نے وہیں پر کھڑے کھڑے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا جہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ مجبوراً مکینک سے اس کا ایڈریس لے کر ہم لوگ گھر واپس آگئے۔

گھر پر پہنچتے ہی شاہ صاحب کا فون آگیا۔ انہوں نے میرے ابو سے اپنے ڈرائیور کی غلطی کی معافی مانگی اوریقین دلایا کہ گاڑی اچھی طریقے سے مرمت کرا کر ایک ہفتے کے اندر اندر گھر پہنچوادی جائے گی اور اس کے علاوہ بھی اگر کوئی جرمانہ ہے تو وہ ادا کرنے کو تیار ہیں۔ ابو شاہ صاحب کی شرافت سے متاثر ہوئے۔ میں نے کہا بھی کہ غلطی سراسر میری تھی اور ہم لوگوں کو ہی الٹا کچھ دینا چاہیے کہ ان کی جیپ پر بہرحال ایک بڑا سا ڈینٹ تو لگ ہی گیا تھا۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ گاڑی کی مرمت کا خرچہ ہمیں شاہ صاحب سے نہیں لینا چاہیے تھا۔ اگرنہ لیتے تو شاید زندگی کا سفر کسی اورطریقے سے کٹتا۔ شاید نہیں جو قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ شاید وہ حادثہ ہی نہ ہوتا تو زندگی کا سفر ذرا مختلف ہوتا اس سے زیادہ بڑھ کر شاید یہ ہو کہ اگرمیں خوب صورت نہ ہوتی تو وہ سب کچھ نہیں ہوتا۔

خوب صورت نہ ہونا تو میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میں خوب صورت تھی، بے باک تھی، گھر میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے سر چڑھی بھی۔ ابو ورلڈ بینک میں کام کرتے تھے۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی، جو چاہتی وہ ہوجاتا۔ ابو کے ساتھ کئی دفعہ لندن نیویارک جا چکی تھی اور دنیا دیکھی ہوئی تھی میں نے۔ شاید اسی وجہ سے بے باک اور پراعتماد بھی ہوگئی تھی۔ دو بھائیوں اوردو بہنوں میں سب سے زیادہ میرا ہی خیال رکھا گیا تھا۔ باجی کی شادی ہوگئی تھی اوروہ اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں رہتی تھیں جہاں ان کا شوہر کیمیکل انجینئر تھا۔ بڑا بھائی کراچی میں گرینڈ لیز بینک میں اچھے عہدے پر کام کرتا تھا اور مجھ سے بڑا واحد لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہا تھا۔ ابوابھی کچھ مہینے ہی پہلے ورلڈ بینک سے ریٹائر ہوکر واپس کراچی پہنچے تھے لیکن ابھی بھی اکثر انہیں کسی نہ کسی کنسلٹنسی کے لیے کبھی یورپ کبھی امریکا آنا جانا پڑتا تھا۔

حادثے کے دسویں دن شاہ صاحب کا ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا۔ گاڑی مکمل طور پر نئی ہوگئی تھی جو پرانی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اسے بھی شاہ صاحب نے صحیح کرادیا تھا۔ ابونے کہا تھا کہ آج کل کے زمانے میں بھی شریف لوگ ہوتے ہیں، بڑی بات ہے۔

بڑی بات تو اس کے بعد ہوئی اور بالکل غیر متوقع طریقے سے ہوئی۔ یہ سب کچھ اتنا تیزی کے ساتھ ہوگیا کہ آج جب

میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ وہ سارے واقعات آندھی طوفان کی طرح ملین میل پر سیکنڈ کی رفتار سے ہوگئے تھے۔

دوسرے دن ہی کی بات ہے کہ شام کے وقت گھر پہ کچھ مہمان پہنچے جن کے ساتھ پھلوں اورمٹھائیوں کے ٹوکرے تھے جنہیں گیراج میں اتاردیا گیا۔ دونوں مہمان شاہ صاحب کے دوست تھے جنہوں نے ابو سے میرا ہاتھ مانگا تھا۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ شاہ صاحب بڑے زمیں دار تھے۔ بڑے وڈیرے، بڑی زمینوں اور حویلیوں کے مالک۔ کراچی میں کئی بنگلے اوربے شمار جائیداد ان کے پاس تھی اور حکومت میں بے انتہا اثرورسوخ۔ ان کی عمر چوالیس سال تھی اور ان کی دوبیویاں پہلے سے تھیں۔ ایک بیوی گاؤں میں تھی جو شاہ صاحب سے عمر میں بڑی تھی، جس سے ان کے کوئی بچے نہیں تھے۔ ایک بیوی حیدرآباد میں تھی جس سے شاہ صاحب کے پانچ بچے تھے اوراب وہ مجھ سے بھی شادی کرنا چاہتے تھے۔

ابو کے غصے کے باوجود ان پیغام لانے والوں نے کہا کہ مجھے ہر طرح کی عزت دی جائے گی۔ دین مہر کی جو رقم طے ہوگی وہ پہلے ہی ادا کردیں گے، ڈیفنس میں ہزار گز پہ بنا ہوا ایک مکان میرے نام کردیا جائے گا اور بہت ساری باتیں وغیرہ وغیرہ۔

مزید پڑھنے کے لیے اگلا صفحہ کا بٹن دبائیں

ابو نے انہیں چائے پلائی اور کسی بے عزتی کے بغیر معذرت کرکے انہیں ان کی مٹھائی اور پھلوں کے ساتھ واپس بھیج دیا۔

ان کے جانے کے بعد انہیں غصہ آیا۔ غصہ مجھ پر آیا کہ میں نے حادثہ کیوں کیا؟ غصہ اپنے اوپر آیا کہ گاڑی کی مرمت خود کیوں نہیں کرائی؟ انہیں شک ہوا کہ شاید مجھے کچھ اس وڈیرے میں دلچسپی تھی، کیا اس نے میری مرضی سے پیغام بھیجا تھا۔ آخر اسے مجھ میں کیوں دلچسپی ہوگئی۔ ایسا سوچا کیسے اس نے، ہمت کیسے ہوئی اسے؟ ہوگا وڈیرہ اپنی زمینوں کا۔ ہم لوگ اس کے ہاری نہیں ہیں جو اس طرح سے سلوک کیا ہے اس نے۔ اسی وقت ابو نے پچیس ہزار کا ایک چیک لکھ کر بھجوایا کہ انہیں اس گاڑی کے مرمت کے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

میں رو دی تھی۔ رو رو کر میں نے بتایا کہ حادثہ کیسے ہوا اور میری کیا بات ہوئی۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ گاڑی کی مرمت کے بارے میں خدشات میرے ذہن میں کیوں تھے۔ وہ پراسرار مسکراہٹ میری سمجھ میں آرہی تھی۔

ابو کا خیال تھا کہ بات ختم ہوگئی لیکن مجھے لگا کہ وہ چھوٹی چھوٹی تیر کی طرح چبھتی ہوئی آنکھیں میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ وہ پراسرار مسکراہٹ میرے اعصاب کو شل کر رہی تھی۔ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن ابو کے بہت گہرے دوست اور دفتر کے ایک پرانے ساتھی گھر آئے اورانہوں نے بتایا کہ شاہ صاحب نے پھر درخواست کی ہے کہ شازیہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ دے دیا جائے۔ وہ شاہ صاحب کے خاندان سے واقف تھے۔

ابو نے انہیں سمجھایا کہ میں ابھی اکیس سال کی بھی نہیں ہوں، ابھی مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔ ابھی میں نے کمپیوٹر کا کورس ختم کرنا ہے۔ ایک پروفیشنل کی زندگی گزارنی ہے۔ اپنے سے ڈبل عمر کے آدمی سے جس کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں شادی کیسے ہوسکتی ہے؟ پھر یہ کوئی جوڑ نہیں ہے، ہم لوگ مہاجر ہیں اوروہ ایک سندھی ڈبل عمر کا عیاش آدمی۔ اس کے اقدار الگ، اطوار الگ، ہمارا رہن سہن الگ، تہذیب جدا۔ میرا خاندان آگے کی طرف جا رہا ہے وہ لوگ ابھی تک کاروکاری اور غیرت کے نام پہ قتل و غارت گری پہ یقین رکھتے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔

انہوں نے ابو سے کہا کہ عمر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دلیپ کمار جب چوالیس سال کا تھا تو سائرہ بانو اکیس سال کی تھی۔ جہاں تک دوسری بیویوں کا تعلق ہے وہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ ایک گاؤں میں رہتی ہے اور دوسری اپنے بچوں میں مصروف۔ تمہاری بیٹی تو موج کرے گی۔ روپے پیسے کی فراوانی ہے، اثرورسوخ والے لوگ ہیں۔ شاہ خاندان ہے سیّدوں کا اور مذہب بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ مذہب میں کہاں لکھا ہے کہ سندھی کی سندھی اور مہاجر کی مہاجر سے ہی شادی ہوگی۔

رہا پروفیشن تو اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آخر کار عورت کو گھر والی ہی بننا پڑتا ہے، بچے ہی پالنے ہوتے ہیں۔ اگر گھر میں اوپر والے کا دیا سب کچھ ہے تو پروفیشن کے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ زندگی میں ایک ہی دفعہ اس قسم کا موقع ملتا ہے جناب۔ شاہ صاحب کی عمر بھلے زیادہ ہوگی مگر وہ تیس پینتیس سال سے زیادہ کے نہیں لگتے ہیں۔ ایک دفعہ شازیہ کی شادی ہوجائے گی تو وہ اسے اتنا خوش رکھیں گے کہ وہ ان کی ہی دیوانی ہوجائے گی۔

رہی بات تہذیب کی تو جب ہندوستان چھوڑ دیا تو سندھ ہی کی تہذیب ہماری تہذیب ہوگئی ہے۔ کاروکاری جیسی جہالت کا تعلق شاہ صاحب سے نہیں۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ دنیا جہان گھومے ہوئے، وسیع القلب وسیع النظر۔ اور ویسے اگر وہ چاہیں تو بھی جاگیرداری ختم نہیں کرسکتے، نہ ہی ہاریوں، کسانوں، مریدوں کا ذہن بدل سکتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس نظام کی گہری جڑیں ہیں یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔

مجھے پتا تھا اس بات پر ابو کو غصہ ہی آیا ہوگا، ان کی طبیعت ہی اس قسم کی تھی۔ انہوں نے ہم بھائی بہنوں میں لڑکا لڑکی کے حوالے سے کبھی بھی فرق نہیں یا۔ ایک پڑھے لکھے سمجھ دار انسان تھے۔ سندھی ہونا ان کے لیے کوئی برائی نہیں تھی۔ سندھی وڈیرہ جو صرف وڈیرہ ہو، عیاشی کرتا ہو، دوسروں کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کو تیار ہو، یہ اُن کے نزدیک سب سے بڑی برائی تھی۔ انہوں نے ہم سب کو اچھی تعلیم دی۔ باجی کی شادی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے کی۔ باجی خود بھی اٹاوا میں وکیل تھیں۔ میرے لیے بھی ان کے یہی خواب تھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں انہیں اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

انکل نے کہا تھا، غصہ نہ کریں۔ سوچیں، ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ شاہ صاحب کا رستہ رُکا نہیں ہے۔ وہ جوسوچتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں اور بڑے آدمی کی بڑی باتیں ہیں۔

دوسری رات بھی خراب رات تھی۔ ابو مجھے پہلی دفعہ پریشان سے لگے۔

دوسرے دن ہی انہوں نے میری فلائٹ لندن کے لیے بک کردی۔ ان کا خیال تھا کہ میں لندن چلی جاؤں وہیں جا کر

پڑھوں اور پھر بعد میں دیکھا جائے گا۔

رات دو بجے کی فلائٹ کے لیے ہم لوگ گھر سے گیارہ بجے نکلے تھے۔ شاہراہِ فیصل پر کارساز سے تھوڑا سا آگے پاکستان ایئرفور کے بیس کمانڈر کے گھر کے سامنے اس جانی پہچانی پجارو نے ہماری گاڑی روک دی اورسب کچھ بہت تیزی کے ساتھ ہوگیا۔ آگے والی گاڑی سے مسلح لوگ اترے اور پیچھے والی گاڑی سے اترنے والوں نے ابو کے ہاتھوں سے ٹکٹ اور پاسپورٹ چھین لیا اور خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

دوسرے دن ہی امی کا پاسپورٹ اور دونوں ٹکٹ لے کر ابو کے ایک اور دوست آئے جنہوں نے ابو کوپ ھر سمجھایا کہ ضد نہ کریں۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ شازیہ اب ان کی ذمہ داری ہے، مستقبل میں شاہ صاحب کی ہونے والی بیوی۔ وہ کیسے ان کے بغیر مرضی کے سفر کرسکتی ہے۔ اگر ایک دفعہ انہوں نے اس کا ہاتھ مانگ لیا ہے تو وہ ان کی ہوگئی ہے۔ ابو کو اس بات پہ فخر ہونا چاہیے کہ اتنا بڑا وڈیرہ اتنے ہاریوں کا مالک ہزاروں مریدوں کا پیر اپنی زمینوں کا سیّد بادشاہ ان سے رشتہ چاہ رہا ہے۔ اب شازیہ کا پاسپورٹ شاہ صاحب کے پاس ہی رہے گا اورانہوں نے درخواست کی ہے کہ شازیہ کو ملک سے باہر بھیجنے کی کوشش نہ کریں، یہ ممکن نہیں ہوگا۔

بھائی، انکل، ابو، امی سب پوری شام مشورے کرتے رہے اورجلدی میں یہی فیصلہ ہوا کہ فیصل سے میری شادی فوری طور پر کردی جائے۔ فیصل کا رشتہ چھ ماہ پہلے آیا تھا جس کے لیے میں نے انکار کردیا تھا کیوں کہ مجھے ابھی اور آگے پڑھنا تھا۔ فیصل کے والد کراچی کے پرانے تاجر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابو کے پرانے دوست بھی تھے۔ فیصل ایم بی اے کرنے کے بعد اپنی ہی کمپنی میں باپ کا ہاتھ بٹارہا تھا۔ ابو نے فیصل کے گھر والوں کوساری بات بتادی جس کے بعد وہ لوگ جلدی شادی کرنے پر راضی ہوگئے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک وڈیرے کی تیسری بیوی بننے سے اچھا ہے کہ ایک پڑھے لکھے تجارتی گھرانے کی بہو بن جاؤں جو مجھے اپنی زندگی کا ساتھی سمجھے گا۔ اپنی جائیداد، باندی یا غلام نہیں۔ میں اُس کے ساتھ کنیز بن کر نہیں رہوں گی۔ اپنی مرضی سے کچھ کرسکوں گی۔ حویلی کی قیدی بن کر تو نہیں جیوں گی۔

ابھی کارڈ چھپنے بھی نہیں گئے تھے کہ فیصل یکایک غائب ہوگیا۔ کراچی شہر میں قتل، اغوا، ڈکیتی اور بوریوں میں لاش کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں۔ سارے خاندان میں تشویش کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ یہ کیوں ہوا تھا۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی فیصل اپنے گھر واپس آگیا مگراس کی واپسی کے بعد ان لوگوں نے شادی سے انکار کردیا۔ نہ کوئی بات نہ چیت۔ فیصل کے ابو نے کہا کہ وہ موجودہ حالات میں اس قسم کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے ہیں جس میں اس طرح سے جان کا بھی خطرہ ہے۔

مزید پڑھنے کے لیے اگلا صفحہ کا بٹن دبائیں

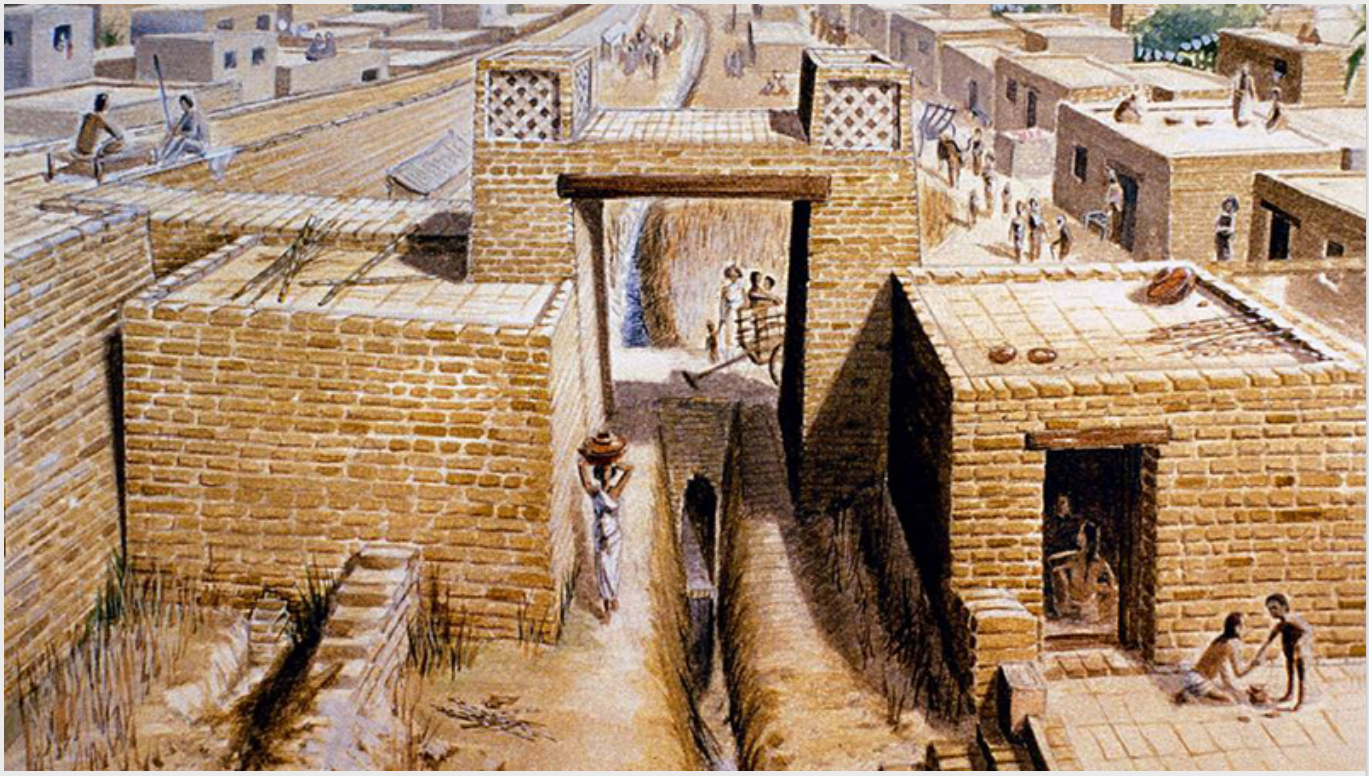

ابو نے چیف سیکریٹری، ہوم سیکریٹری، آئی جی پولیس اور اسلام آباد تک اپنے اثرورسوخ کو استعمال کرلیا مگر ہر جگہ سے شروع میں پذیرائی کے بعد یہی جواب ملا تھا کہ وہ لوگ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے ہیں۔ کوئی بھی جرم نہیں ہوا ہے اور اگر ہوا بھی ہے تو نہ اس کے شواہد ہیں نہ ہی ثبوت۔

شاہ صاحب کا بڑا سیاسی خاندان تھا۔ ہر سیاسی جماعت کے بڑے لیڈروں تک ان کی پہنچ تھی۔ سیکریٹری اور کمشنر جیسے لوگوں سے یارانہ تھا، ہزاروں ایکڑ زمینوں کے مالک تھے، بڑے وڈیرے جن کے ہاری ان پر جان دیتے تھے۔ ان کی شادی کے سلسلے میں حکومت کیا کرسکتی ہے۔ حکومت کے تو یہ کام ہی نہیں ہوتے۔

میں نے پہلی دفعہ اپنے باپ کے چہرے پر مایوسی دیکھی۔ شدید مایوسی اورشدید ڈپریشن۔ دولت اثرورسوخ جان پہچان سب کچھ بے کار تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے اپنے لڑکی ہونے پر غصہ آیا۔ میں نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں۔ میں نے گھرسے باہر آنا جانا بند کردیا۔ گھر پہ پرائیویٹ گارڈ کا اضافہ کردیا گیا تھا۔

ایک دن ابو اور بھیا ہی شاہ صاحب کے گھر جا پہنچے تھے۔ یہ مجھے بعد میں پتا لگا۔ بھیا نے ہی بتایا تھا۔ شاہ صاحب نے ابو اور بھیا کو بہت عزت دی۔ بہت ہی اخلاق سے بات کی۔ ابو نے سمجھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے جانتے ہوئے اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کروں جو شادی شدہ ہے، عمر میں ڈبل ہے اورجس سے میری بیٹی شادی بھی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ شاہ صاحب نے پورے عزت و احترام سے کہا کہ عمر کا مسئلہ شاہ صاحب کا مسئلہ نہیں ہے۔

انہوں نے ابو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مذہب میں عمر کا فرق کوئی فرق نہیں ہے اورمردوں کو تو چار شادی کی اجازت بھی ہے اوراب تو میں ان کی عزت ہوگئی ہوں اور اب یہ شادی تو ہوگی اور آپ کی بیٹی اورآپ لوگوں کی مرضی سے ہی ہوگی۔ میں اس معاملے میں جبر کا قائل نہیں ہوں اورجب بھی یہ شادی کروں گا آپ کی بیٹی کی مرضی سے ہی کروں گا۔ وہ لوگ بہت مایوس واپس آئے۔ شاہ صاحب دونوں کو گاڑی تک چھوڑنے آئے بڑی عزت کے ساتھ۔ بھیا نے کہا تھا کہ انہیں ایسا لگا جیسے سفید شلوار قمیض کے اندر بظاہر تو بہت ہی مہربان انسان تھا لیکن اندر بہت اندر ایک حیوان، بپھرا ہوا ضدی اور بے چین آدمی ہے، انسان کی شکل میں بھیڑیا۔

ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ میں گھر میں نظربند تھی۔ ایک رشتہ اور تھا جسے ہاں کیا گیا توان

لوگوں نے بھی تین دن کے بعد رشتہ واپس لے لیا۔ مجھ سے ماں کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی تھی، باپ کا چہرہ جیسے ہزاروں سال کا ہوگیا تھا۔

مہینہ گزرگیا اور کسی طرح سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ میں پاکستان چھوڑسکوں یا اپنی تعلیم شروع کرسکوں یا کسی ایسی جگہ رشتہ ہوجائے جو مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے جانے کی ہمت بھی رکھتے ہوں۔

پھر یکایک بہت ساری باتیں ہوگئی تھیں، میں اپنے نے پاسپورٹ پر برٹش ایمبیسی ویزا لینے گئی۔ بہت دنوں کے بعد صبح سویرے نکلی تھی۔ بھیا اور گارڈ بھی ساتھ تھے۔ مگر کلفٹن پہنچے سے بہت پہلے گارڈ اور ہماری گاڑی کو پولیس نے روک لیا۔ ابھی پولیس والوں سے بات ہی ہورہی تھی کہ دو اور کاریں آن پہنچی تھیں اور یکایک مجھے یہ پتا لگا کہ مجھے اٹھا کر دوسری کار میں ڈال دیا گیا ہے، نہ میں چیخ سکی نہ رو سکی۔ بے حواس ہوکر جو بھی کہا، اس کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر۔ میرے حواس ایک بڑے سے گھر پہنچ کر بحال ہوئے۔

وہ گھر بھی شاہ صاحب کا ہی گھر تھا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس آئے گی۔ کہیں سے کوئی مدد پہنچے گی۔ بیسویں صدی میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کیسے کوئی اس طرح سے کسی کو اغوا کرسکتا ہے۔ آج کے زمانے میں جب عورت کی آزادی کا ڈنکا پیٹا جارہا ہے۔ جب عورت وزیراعظم بھی ہے، صدر بھی ہے، پائلٹ بھی ہے، خلا باز بھی ہے، جج بھی ہے، سائنس داں بھی ہے مگر کوئی مدد نہیں آئی۔ شام کو شاہ صاحب ملنے آئے تھے۔

میں اور وہ اس کمرے میں اکیلے تھے۔ وہی کلف زدہ سفید شلوار قمیض، سرخ و سفید چہرے پہ بھری موٹی کالی مونچھیں اور دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی تیر جیسی آنکھیں۔ انہوں نے مجھ سے بڑے پیار سے بات کی۔

”شازیہ! میں آپ کی عزت بھی لے سکتا ہوں۔ آپ کے خوب صورت چہرے کو برباد کرسکتا ہوں تاکہ کبھی بھی کوئی بھی آپ سے شادی نہ کرے۔ آپ کی جان بھی لے سکتا ہوں۔ مگر میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا کیوں کہ میں آپ سے شدید محبت کرتا ہوں۔ آپ کو صرف بیوی بنا کر ہی یہاں رکھوں گا، نکاح کروں گا آپ سے۔ عزت سے لے کر آؤں گا آپ کو اور اگر میری بات نہیں مانیں گی تو کوئی بھی آپ سے شادی نہیں کرسکے گا۔ آپ کبھی یہ ملک چھوڑ کر نہیں جا سکیں گی۔

میں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسی خواہش کی ہی نہیں ہے جو پوری نہ ہوئی ہو۔ جومیں نے چاہا اسے حاصل کیا ہے، جو میں چاہوں گا اسے حاصل کرلوں گا۔ آپ کے ابو نے ورلڈ بینک میں کام کیا ہوگا اور لندن امریکا میں ان کے دوست بھی ہوں گے مگر پاکستان میں وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ پولیس، یہ وکیل، یہ جج، یہ قانون سب میں خرید لوں گا چاہے کوئی بھی قیمت ہو۔ کوئی بھی میری راہ میں نہیں آسکتا، جو آئے گا اس کا علاج میرے پاس ہے۔ ”شاہ صاحب کے چہرے پر وہ پراسرار مسکراہٹ بہت گھمبیر تھی۔

میں بے تحاشا رو پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، کیا کہوں۔ کس مصیبت میں گرفتار ہوگئی؟ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ پنجرے میں بند پرندے کس طرح بے چین ہوکر تڑپتے ہیں، کیسے دل کرتا ہوگا ان کا۔

انہوں نے پھر کہا، ”جب میں نے آپ کو خیابانِ محافظ کے اس حادثے کے وقت دیکھا تھا تو اسی وقت فیصلہ کرلیا تھاکہ آپ صرف میری ہیں اور میں آپ کو بتا دوں کہ یہ فیصلہ بدلنے والا نہیں ہے۔ آپ کو آپ کے گھر والوں کو وہی عزت ملے گی جو ملنا چاہیے۔ میں نے ہر طریقے سے آپ کے ابو کو سمجھایا ہے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ آپ پڑھی لکھی ہیں، سمجھ دار ہیں، خود بھی سمجھیں اور انہیں بھی سمجھائیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب آپ کی حیثیت سب سے بلند ہوگی، آپ کے بچوں کو زیادہ حصہ ملے گا اور آپ کو کوئی بھی میری بیوی بننے سے روک نہیں سکے گا۔ “

مجھے لگا کہ شاہ صاحب کے چہرے پر بلا کا اطمینان ہے، آنکھوں میں عجیب سی آگ ہے، ساتھ ہی حاکم کا سا غرور بھی۔ مجھے صرف یہی سمجھ میں آیا کہ میں کسی دلدل میں ڈوبتی چلی جارہی ہوں۔ آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے۔

”کل آپ دلہن بنیں گی، میرا اور آپ کا نکاح ہوجائے گا۔ میں نے یہ مکان آپ کے لیے خریدا ہے۔ اسے آپ کے نام کردوں گا۔ آپ کا دین مہر بھی آپ کو ادا کردوں گا۔ زیورات سے سجا دوں گا آپ کو۔ مگر ہاتھ نہیں لگاؤں گا آپ کو۔ نکاح کے بعد آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا۔ پھر آپ کے گھر والوں کی ہی مرضی سے رخصتی ہوگی، آپ کی مرضی سے رخصتی ہوگی۔ آپ نے ہی یہ کام کرانا ہے۔ اسی میں آپ کی بھی عزت ہے آپ کے خاندان کی بھی عزت ہے۔ آپ اچھی طرح سے یہ بات سمجھ لیں کہ پولیس، ملٹری اور عدالتیں کچھ بھی نہیں کرسکتی ہیں میرا۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور میری جیب بہت بھاری۔ ان سب سے بھی زیادہ میرا پیار مضبوط ہے جو صرف آپ کے لیے ہے۔ ایک آخری بات یہ کہ میں بہت ضدی آدمی ہوں۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا ہے کہ میں نے اپنی ضدی پوری نہ کی ہو اور آپ کا معاملہ تو بہت ہی خاص معاملہ ہے۔ آپ کو اب تک اندازہ تو ہوگیا ہوگا۔ “

یہ کہہ کر شاہ صاحب چلے گئے۔ میں رات بھر روتی رہی، جاگتی رہی۔ دوسرے دن شام کو ایک بند گاڑی میں نکاح نامے کی کاپی، پھل، مٹھائیوں کے ساتھ شاہ صاحب نے مجھے میرے گھرپہنچادیا۔ اس پیغام کے ساتھ کہ جب بھی ہم لوگ چاہیں گے وہ مجھے رخصت کرا کر لے جائیں گے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں ہے، جتنے دن چاہیں شازیہ کو رکھیں۔ نان نفقہ کی ذمہ داری ان کی ہے۔ میری دیکھ بھال بھی ان کے ذمے۔ آگے سب کچھ وہ ہم سب کی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔

مزید پڑھنے کے لیے اگلا صفحہ کا بٹن دبائیں

پھر وہی کچھ ہوا جو وہ چاہتے تھے۔ میں دوراتوں میں لڑکپن پھلانگ کر جہاندیدہ عورت بن گئی۔ میری وجہ سے میرا پورا خاندان مسائل کا شکار ہوتا چلا جارہا تھا۔ ایک دکھ کا سلسلہ تھا جس نے مکڑے کے جالے کی طرح پورے خاندان کو جکڑ لیا تھا۔

میں نے کہا، مجھے رخصت کردیں۔ اب میں خود بھی شاہ صاحب کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے امی نے سمجھایا، باجی کینیڈا سے آگئی تھیں، میرے سامنے رو دیں۔ ابو نے کہا کہ وہ لڑیں گے آخر تک لڑیں گے مگر مجھے پتا تھا کہ کراچی میں، پاکستان میں کچھ بھی نہیں ہوسکے گا۔ یہاں جنگل کا قانون ہے، یہاں عورت ایک کھلونا ہے، یہاں مردوں کی حکومت ہے اور مرد بھی وہ جن کے پاس اقتدار ہے، دولت ہے، جو قسمتوں کے مالک ہیں، جو

غریبوں کے اَن داتا ہیں۔ فوج، پولیس، وکیل، جج، عدالت تومحض نام ہیں ان کٹھ پتلیوں کا جو اَن داتا کی مرضی سے سب کچھ کرتے ہیں، چلاتے ہیں اور چلاتے رہیں گے۔

میری رخصتی ہوگئی سادگی کے ساتھ۔ میں ایک گھر پہنچ گئی جس کے اندر نوکر تھے، خادمائیں تھیں، ڈرائیور اور کاروں کا انبار تھا، دولت کی فراوانی تھی۔ میں جوچاہوں کرسکتی تھی، جس طرح سے چاہوں رہ سکتی تھی، میں صرف شازیہ نہیں تھی۔ شاہ صاحب کی قانونی اور سب سے زیادہ پیاری بیوی تھی۔

دو ماہ کے بعد ہی ابو پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گئے۔ امی کو باجی کینیڈا لے گئیں توپھر وہ واپس نہیں آئیں۔ بھیا بھی لندن چلے گئے۔ شاہ صاحب کے نہ چاہنے کے باوجود ہمارا خاندان برباد ہوگیا، مگر ان کوان کی پسند کی وفادار تیسری بیوی مل گئی تھی۔ ایک مینا کی طرح قید۔ چاندی کے جنگلے میں، سونے کے تالوں کے پیچھے۔ میں اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی سے شکوہ کرتی۔ زندگی کو قبول کرلیا تھا میں نے۔

میں نے شاہ صاحب کے لیے تین لڑکیاں پیدا کیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ جنسی تعلقات میں عورت کا کیا کردار ہوتا ہے؟ بچوں کے پیدا کرنے میں اس کی کیا مرضی ہوتی ہے؟ مجھے تو یہی پتا تھا کہ مرد کی مرضی سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جب چاہتے ہیں فیصلہ کرلیتے ہیں۔ عورت کے لیے چاہے وہ ڈیفنس میں رہنے والی شاہ صاحب کی بیوی شازیہ ہو یا اورنگی میں رہنے والی عمر پنکچر بنانے والی کی بیوی رضیہ ہو۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ میں شاہ صاحب کی قانونی نکاح شدہ بیوی ہوں جنہیں مجھ سے بہت پیار ہے۔

جنہوں نے مجھے اس لیے حاصل کیا ہے کہ میرے ساتھ سوئیں اور جوکچھ بھی کرسکتے ہیں کریں۔ یہ حق انہوں نے میری مرضی سے حاصل کیا ہے۔ میرے دستخط موجود ہیں نکاح نامے کے چیتھڑوں پہ اور اب میں ان کی عزت ہوں جس کے تحفظ کا پورا استحقاق ہے انہیں۔ مجھے اپنے حمل سے بھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے صرف خوف ہوتا تھا کہ مجھے کوئی لڑکا نہ ہو جائے کوئی بیٹا نہ پیدا ہو۔ تینوں بار حمل کے دوران مجھے خواب میں ایک ننھا سا لڑکا کلف والے سفید شلوار قمیض میں ملبوس اپنے چہرے پر گھنی گھنی کالی کالی مونچھوں اور گہری دھنسی ہوئی آنکھوں سمیت نظر آتا تھا اور اس سے بھی زیادہ عجیب ہوتی تھی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی پراسرار مسکراہٹ۔

مجھے لگتا تھا جیسے وہ آ رہا ہے میرا بیٹا مجھے ہی پامال کرنے۔ میرا دل کرتا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں سے لمبی سی آنول نال چھین کر اپنے گلے کا پھندا بنالوں۔ ماں بن کر ایسے بچے کو جنم دینے سے اچھا ہے کہ مائیں خودکشی کرلیں مگرمیری آنکھ کھل جاتی تھی بار بار۔ اس کے گول گول موٹے سے چہرے پہ مونچھوں کے ساتھ وہی زہریلی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ وہ میری کوکھ کی دیواروں کو زور زور سے پیٹتا رہتا تھا۔

شادی کے آٹھ سالوں میں صرف تین بار ہی مجھے حقیقی خوشی ہوئی، جب بھی مجھے پتا لگا کہ میں نے بیٹی کو جنم دیا ہے، بیٹے کونہیں۔ میں چوم چوم لیتی تھی اپنی بیٹیوں کے چہرے کو۔ خوش ہوجاتی یہ دیکھ کر کہ میں اس دنیا میں اپنے شوہر جیسا کوئی اور لے کر نہیں آئی ہوں۔ میری وجہ سے کسی کی خوشیاں پامال نہیں ہوں گی۔ کسی کا گھربرباد نہیں ہوگا۔ میں سوچتی کہ ایسے بیٹوں کا گلا مائیں گھونٹ کیوں نہیں دیتی تھی۔ کوکھ کا یہ گناہ پروان ہی کیوں چڑھتا ہے۔ ایسی زندگی کا عذاب تو قبر کے عذاب سے بھی برا ہے۔

پھر نجانے کیا ہوا کہ شاہ صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے بچوں کے ساتھ لندن دکھائیں گے۔ گھمائیں گے، ہم سب کے پاسپورٹ بنے اور اس دن کارساز پر ایئرفورس کے بیس کمانڈر کے گھر کے سامنے کسی نے ہمیں روکا بھی نہیں۔ ایک بار پھر میری زندگی میں سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ ہوا تھا۔

لندن میں شاہ صاحب کے کئی اپارٹمنٹ تھے اور بے شمار دوست۔ وہاں ان کا نہ کوئی ہاری تھا نہ کوئی مرید مگر دولت کی طاقت نے وہ سب کچھ خریدا ہوا تھا جن کی انہیں ضرورت تھی۔ میں سوچتی کہ شاہ صاحب اور شاہ صاحب جیسے سارے پیر، وڈیرے، سردار، چودھری، خان، تمن دار، نواب دن ہفتے مہینے سالہا سال لندن میں یورپ میں گزارتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ معمولی سے معمولی انسان بھی کسی کا غلام نہیں زندگی کتنی حسین ہے وہاں۔ آزاد لوگ،

آزادی اور وقار کے ساتھ۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ اس آزادی کے حق دار ان کے ہاری بھی ہیں، کسان بھی ہیں، وہ عورتیں بھی ہیں جو کھیتوں میں کام کرتی ہیں، جو شہروں میں محنت کرتی ہیں، جو خیابانِ غازی اورخیابانِ محافظ کے موڑ پہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھتی ہیں۔ یہ سوچ تھی صرف سوچ اورسوچوں کا کیا ہے۔

بیکر اسٹریٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں ہم لوگ جا کر رکے اور دوسرے دن ہی جب شاہ صاحب اپنے کسی آدمی کے ساتھ کہیں گئے، میں اس اپارٹمنٹ سے پہلی دفعہ اپنی مرضی سے رخصت ہوگئی۔ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ۔ یہ سب کچھ اتنا آسانی سے ہوسکتا ہے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اپارٹمنٹ کے سامنے سے ہی میں نے ٹیکسی لی تھی اوراپنے چھوٹے بھائی کے دیے ہوئے پتے پر کورائی ڈن کے اس مکان میں پہنچ گئی جہاں وہ رہتا تھا۔

وہ گھر پر نہیں تھا مگر اس کے پڑوس میں انڈیا کا ایک خاندان رہتا تھا۔ انہوں نے میری مدد کی۔ ان کے گھر سے ہی میں نے اسے فون کیا اور وہ فوراً ہی پہنچ گیا تھا۔ اس کے گلے لگ کر مجھے لگا میں آزاد ہوگئی ہوں۔ دور پاکستان میں کراچی کے ایک قبرستان میں میرے ابو کی قبر پہ کسی بہت بڑے گھنے درخت نے سایہ کردیا ہے۔

میں نے حکومت برطانیہ سے پناہ کی درخواست کی اور مجھے پناہ بھی مل گئی۔ شاہ صاحب نے بہت کوشش کی تھی کہ مجھ سے ملیں۔ جنگل کے قانون میں تو یہ ممکن تھا مگر لندن کے قانون میں ناممکن۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس بھری بھری مونچھوں والا وہ شخص جس کی آنکھیں تیر کی طرح چبھتی تھیں، اب میرا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کراچی کے قبرستان میں صرف میرے باپ کی قبر ہی کھود سکتا تھا وہ۔